۱

بازار سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ چوک میں بہت سے لوگ جمع ہیں اور انہوں نے کسی شخص کو گھیر رکھا ہے۔ مجھے وہ شخص تو نظر نہیں آیا البتہ گروہ کے شور اور لوگوں کی تعداد سے اندازہ ہوا کہ کوئی اہم واقعہ ہو گیا ہے اور لوگ بہت ہی غصے میں ہیں۔

ہمارے تخت پور کا یہ چوک نانک شاہی اینٹوں کے فرش کا پکا چوک تھا اور اس کے چاروں طرف عیاری 'کپڑے' صرافے' برتنوں اور پنساریوں کی بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ ان کے درمیان ٹک سک کی دوسری چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی تھیں جن کے کوٹھے ننگے تھے اور ان پر بوریوں کے ٹاٹ والے چھوٹے چھوٹے بیت الخلا تھے۔ بڑی دکانوں پر ان کے سائز کے مطابق مکے چوبارے تھے جن کی سیڑھیاں دکانوں کے پہلو سے چڑھتی تھیں اور کھڑکیاں چوک میں کھلتی تھیں۔

چوک کے درمیان میں سیمنٹ کا ایک خشک فوارہ تھا جسے کمیٹی نے پانی کا کنکشن نہیں دیا تھا' حالانکہ یہ فوارہ بھی کمیٹی کا تھا اور پانی بھی کمیٹی کا لیکن محصول چنگی کے کسی آئٹم پر جھگڑے کی وجہ سے فوارے کو پانی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس فوارے کے اندر مزدور اپنی پگڑیاں بچھا کر اور بوریوں کو گچھا مچھا کر کے تکیے بنا کے سوتے تھے۔ فوارے کے باہر ان کی ہتھ گاڑیاں کھڑی ہوتیں اور گاڑیوں کے نیچے بازار کے کتورے اور ان کے دوست کتورے چھوٹے چھوٹے پیشاب کر کے دیر دیر تک سویا کرتے۔

جن لوگوں نے چوک میں ایک شخص کو گھیرا ہوا تھا وہ اس فوارے کے پاس جمع تھے اور آگے بڑھ بڑھ کر اس شخص کو 'لپڑ' مکے اور ٹھڈے مار رہے تھے۔ وہ شخص زمین پر گرا ہوا تھا اور آدمیوں کا گروہ اس کے گرد ایک قد آدم تنور کی طرح گھیرا ڈالے کھڑا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس تنور کے شگاف میں اپنی تھوتھنی گھسا کر دیکھا کہ ایک نوجوان سا لڑکا ہے۔ سر پر

WWW.PAKS

ڈبیوں والا رومال کس کے بندھا ہوا کالر والی نیلی قمیص، سفید شلوار، پاؤں میں ادھوڑی کے جوتے اور چہرے پر ڈاڑھی کی نئی نئی فصل۔ وہ چوک کے نانک شاہی فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا اور اس نے اپنا سر زانوؤں میں دبا رکھا تھا۔

جب لوگوں نے "مارو مارو...... اور مارو" کا نعرہ بلند کیا تو لالہ رام چند صراف نے عینک اتار کر کہا: "بھائی قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لو اسے پولیس کے حوالے کر دو۔"

"ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔" سب نے لالہ جی کی تائید کی اور چور کو کھڑے ہونے کا حکم دیا۔

چور نے بھائی گور بخش سنگھ کتابوں والے کی دکان سے تاج کمپنی کا ایک قرآن شریف چرا لیا تھا اور ادھر ادھر دیکھ کر اپنی قمیص کے اندر اڑس لیا تھا۔ بھائی گور بخش سنگھ کی دکان پر آدھی قیمت پر پرانی کتابیں بیچنے اور نئی کتابیں خریدنے والے طالب علموں اور ان کے والدین کا ہجوم تھا، کسی نے کوئی توجہ نہ دی۔ سامنے پرنائی شربت والے نے چوری کے اس سارے عمل کو سلوموشن میں بڑی تفصیل سے دیکھا تھا۔ اس نے چور کے کامیاب اقدام کو اپنی منحوس آواز سے ذلت و رسوائی میں تبدیل کر دیا۔ بھائی گور بخش سنگھ اپنے پھٹے سے ننگے پاؤں کود کر چور کو گردن سے پکڑ لائے اور سب کے سامنے اس سے مال مسروقہ برآمد کر لیا۔

یہ ہلکے سنہرے کارڈ بورڈ کی جلد والا قرآن شریف تھا، جس کی سورۃ فاتحہ پانچ رنگے بلاکوں میں چھپی تھی اور باقی کا سارا قرآن شریف دو رنگا تھا۔ ترجمہ مولوی فتح محمد جالندھری کا تھا اور حاشیوں پر ضروری وضاحت درج تھی۔

جب غصے میں بپھرا ہوا گروہ نوجوان کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر تھانے کی طرف لے چلا تو ماسٹر بالی اپنے چوبارے کی کھڑکی سے اس کشاں کشاں جلوس کو دیکھ کر ننگے پاؤں چوک میں اترے اور بھائی گور بخش سنگھ کا راستہ روک کر بولے: "کتنے کا ہے بھائی جی؟"

بھائی جی نے غصے سے ہاتھ جھٹک کر کہا: "خدا کا کلام انمول ہے اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔"

"میرا مطلب ہے تجارتی اولا بدلا کتنی ہے؟" ماسٹر بالی نے شرمندگی ٹالتے ہوئے کہا:

"چھ روپئے" بھائی جی نے چور کو غصے سے گھورا اور اسے مارنے کو ایک بار پھر ہاتھ اوپر اٹھایا۔

ماسٹر بالی نے اپنے کلف لگے ململ کے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہلکے سے خوف سے ان کا چہرہ ذرا سا سنجیدہ ہو گیا۔ اس میں سے پانچ کا ایک نوٹ برآمد ہوا اور ماسٹر بالی نے

OCIETY.COM

دھیمی آواز میں کہا: "آپ یہ رکھیں بھائی جی میں ایک روپیہ جا کے بھجواتا ہوں۔"

جب بھائی گور بخش سنگھ نے پانچ کا نوٹ پکڑ لیا تو گروہ کا تنور مرغیوں کے الٹے ٹاپے کی طرح کھل گیا۔ پھر چھدرا ہونے لگا اور آہستہ آہستہ لوگ پرے ہٹتے ہٹتے غائب ہو گئے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے جارج ششم کی مورت والا ایک روپیہ اپنی جیب سے نکالا اور ماسٹر بالی کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا۔ انہوں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور میں نے آگے بڑھ کر وہ روپیہ بھائی گور بخش سنگھ کو دے دیا۔ اپنے چھ روپے پورے ہو جانے کے بعد بھائی جی بڑبڑ کرتے اور گالیاں بکتے اپنی دکان کی طرف مڑ گئے۔

وہ نوجوان ابھی تک اسی طرح کھڑا تھا اور اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ جب ماسٹر بالی نے محبت سے پچکار کر کہا: "جاؤ بیٹا جاؤ" تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ وہ روتا جاتا تھا۔ قرآن شریف کو چومتا جاتا تھا اور نکسیر کی وجہ سے سنہرے کارڈبورڈ کا ٹائیٹل کتھئی ہوتا جا رہا تھا۔

ماسٹر بالی نے جاتے ہوئے نوجوان پر اپنی نگاہیں گاڑ کر دونوں ہاتھ دعا کیلئے اٹھائے۔ دل ہی دل میں کچھ کہا اور میری طرف دیکھے بغیر فرمایا: "کل میرے چوبارے پر تشریف لا کر روپیہ لے جائیے گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

ماسٹر بالی کلارنٹ بجاتے تھے اور لچھو بساطی کے چوبارے میں اکیلے رہتے تھے۔

ہمارا تخت پور کوئی بڑا شہر نہیں تھا ضلع کی ایک تحصیل تھی۔ پہلے اس کو سرکاری کاغذات میں قصبہ لکھتے تھے لیکن 1935ء میں جارج پنجم کی سلور جوبلی پر اسے شہر لکھا جانے لگا۔ بائیس ہزار کی آبادی۔ ایک بڑا تحصیلدار ایک چھوٹا۔ ایک سب انسپکٹر ایک اے ایس آئی۔ تھانے کے علاوہ گھڑ سوار دریلی جتھہ۔ چھوٹی گیج کا چار سگنلوں والا ریلوے سٹیشن۔ ایک ایل ایس ایم ایف ڈاکٹر۔ دو ٹرینڈ کمپاؤنڈر۔ لاریوں کے اڈے سا تھ برف کا کارخانہ۔ گئوشالہ کی تنگ گلی میں ٹھنڈو رام کی بوتلیں بھرنے والی مشین اور قبرستان کے پاس لالہ نتھو رام کی جننگ فیکٹری۔ لوگ شام کے وقت اس فیکٹری کے پھاٹک پر لالہ جی کی ذاتی بجلی کے لائٹ جلتے دیکھنے جاتے تھے۔ ہمارے شہر میں سب کچھ تھا بس ایک بجلی نہیں تھی اور بجلی کے نہ ہونے سے باہر کے لوگ ہمارے شہر کو قصبہ ہی سمجھتے تھے اور قصبہ ہی کہتے تھے حالانکہ یہاں دنیا بھر میں دوسرے نمبر کا گورد وارہ تھا اور ٹھگوں کا بہت بڑا استھان تھا۔

موگا تو صرف آنکھیں بنانے والے ڈاکٹر متھرا داس کی وجہ سے مشہور تھا لیکن ہمارا

WWW.PAKS

شہر ضلع بھر میں سب سے بڑی اناج منڈی اور اپنے گوردوارے کی وجہ سے پنجاب میں شہرت رکھتا تھا۔ یہاں کے لوگ بڑے بانکے اور اپنی مرضی کے مالک تھے۔ بڑی بڑی..... اور سورما قسم کی عورتوں کو ادھال کر لے جانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ لمبی لمبی جیلیں کاٹ کر جب ملزم واپس اپنے شہر آتے تو ریلوے سٹیشن پر بینڈ باجے کے جلو میں اپنے گھر جاتے جہاں بڑے بڑے تنبوؤں میں میٹھے چاول کی دیگیں غریبوں میں تقسیم کی جاتیں اور مٹی کے آبخوروں میں برف ڈال کر شکر کا شربت پلایا جاتا۔

ماسٹر بالی بینڈ میں کلارنٹ بجاتے تھے' لیکن بینڈ والوں کی وردی نہیں پہنتے تھے۔ سفید کلف لگا ململ کا کرتہ اور چابی کے لٹھے کی کھڑ کھڑ کرتی شلوار۔ کانوں میں سونے کی نتیاں اور آنکھوں میں بھاری سرمہ۔ چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں۔ چوڑا ماتھا۔ پاؤں میں ریشمی ٹائی کی سیاہ گرگابی اور کلائی پر موٹے شیشے کی ویسٹ اینڈ گھڑی۔ بینڈ سے الگ تھلگ ایک طرف ہو کر کلارنٹ بجاتے اور دھن کا ساتھ نہ دیتے۔ جب وقفہ ہوتا تو دھیمے سروں میں اپنا ساز چھیڑتے اور سروں کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ایک اونچی کوک فریاد قائم کر کے بند دروازے پر ایک صدا سی لگاتے اور کلارنٹ منہ سے نکال کر کھڑے ہو جاتے۔ وہ بینڈ کا ایک حصہ نہیں تھے' بینڈ ان کا ایک جزو تھا۔ خود بینڈ والوں میں شامل نہیں تھے سارا بینڈ ان کی فرع تھا' پتہ نہیں وہ اس کام کی اجرت بھی لیتے تھے یا نہیں البتہ وہ بینڈ والوں کے کہنے پر آ ضرور جاتے تھے۔ واپسی پر وہ اپنا کلارنٹ کیس ہاتھ میں لٹکائے جاتے بھی اکیلے تھے اور اسی طرح آتے بھی اکیلے تھے۔ میں نے انہیں نہ تو کبھی گلیوں بازاروں میں گھومتے دیکھا اور نہ دوستوں یاروں کی سنگت میں موجود پایا۔ کچھ اس طرح سے تھے کہ یہیں کہیں تھے اور کچھ ایسے رہتے تھے کہ ہر وقت غیر حاضر سے نظر آتے۔ چلتے تو نامعلوم سے گزر جاتے۔ انتہائی خاموشی کے باوصف ان کی آنکھوں میں بلا کی فصاحت تھی۔ اپنی نرم روی اور خوشگوار مسکراہٹ سے انہوں نے اپنے اور لوگوں کے درمیان لاتعلقی کا ایک پردہ کھینچ رکھا تھا اور لاتعلقی کی یہ تہ اس قدر سخت تھی کہ اس پردے کی اوٹ سے کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔

جب میں سکول میں پڑھتا تھا تو ماسٹر بالی میرے ہیرو تھے اور جب میں کالج میں داخلہ لے کر گرمیوں کی چھٹیوں میں واپس گھر آیا تو ان کی شکل ایسے محبوب کی سی ہو گئی تھی جس کے ساتھ ہر وقت بھاگ جانے کو جی چاہنے لگے۔ وہ عمر میں مجھ سے تین چار سال بڑے ہوں گے' لیکن رتبے میں بہت آگے پہنچے ہوئے تھے۔ اتنے آگے کہ اس سے آگے اور کچھ ہوتا ہی

نہیں۔ نہ منزل نہ نشان نہ خیال نہ واہمہ۔

میں ماسٹر بالی سے ملنا چاہتا تھا اور مل نہ سکتا تھا۔ بات کرنی چاہتا تھا اور میرا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ دیکھنا چاہتا تھا اور وہ نظر نہیں آتے تھے۔ ان کی ذات میں ایک عجیب طرح کا شفقت آمیز تہور تھا جیسے ایرینا میں داخل ہونے والے بُل کے وجود پر ہوتا ہے۔ اسے معلوم تو ہوتا ہے کہ وہ مغلوب ہو جائے گا' لیکن یقین نہیں ہوتا۔ ماسٹر بالی بھرے پرے شہر کے سنسان ایرینا میں سنگھارے ہوئے بُل کی طرح موجود تھے حالانکہ نہ ان کی کوئی تعلیم تھی' نہ امیر تھے' نہ عالی نصب' نہ ہی ان کی کوئی بیک گراؤنڈ تھی۔

اگلے روز جب میں ان سے اپنا روپیہ واپس لینے کیلئے ان کی سیڑھیاں چڑھا تو چارپائی پر آلتی پالتی مارے اپنا کلارنٹ صاف کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور سامنے پڑے ہوئے موڑھے پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بڑی دیر تک اپنے کلارنٹ کے ٹوٹے صاف کرتے رہے اور میں بڑی دیر تک اس طرح بیٹھا رہا۔ پھر انہوں نے چہرہ اوپر اٹھائے بغیر آہستہ سے کہا "وہ نوجوان کسی قریبی گاؤں کا معلوم ہوتا تھا۔"

"جی" میں نے مرعوب ہو کر ویسی ہی آہستگی سے جواب دیا۔

"اگر اپنے تخت پور کا ہوتا تو پہلے بھی کہیں ضرور نظر آتا۔"

"جی! درست ہے" میں نے ان کا فرمانا تسلیم کرتے ہوئے کہا "وہ کسی قریبی گاؤں ہی کا تھا اور قرآن شریف لے کر اپنے گاؤں ہی چلا گیا۔"

"لوگ بھی بڑے مورکھ ہوتے ہیں" انہوں نے دکھی لہجے میں کہا۔

"جی بیشک' مورکھ بھی ہوتے ہیں اور ظالم بھی۔"

"اور یہ سارا ظلم مورکھتائی کی وجہ سے ہے" انہوں نے سر اوپر اٹھائے بغیر کہا "اگر بات سمجھ میں آجائے تو انیائے ختم ہو جاتا ہے۔ پر بات سمجھ میں آتی نہیں' ادھر ادھر سے گزر جاتی ہے..... اسے مارنا نہیں چاہیے تھا۔"

"اس نے چوری جو کی تھی ماسٹر جی" میں نے حوصلہ کر کے کہا "تو پھر لوگوں نے اسے مارنا ہی تھا ناں۔"

وہ تھوڑی دیر اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے پھر اپنے آپ سے کہنے لگے "صاحبزادے! ہم سبھی چور ہیں' کوئی مول کا چور کوئی بیاج کا چور۔ کوئی چور کا چور کوئی یار کا چور! یہ سارا بادھا پسارا چوری یاری کا ہی ہے۔ وہ چور نہیں تھا یار تھا۔"

WWW.PAKS

"کون چور نہیں تھا" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"وہی نوجوان جس نے قرآن شریف چرایا تھا۔"

پھر وہ اپنے سامان کو اسی طرح چھوڑ کر اندر کمرے میں چلے گئے۔

ماسٹر بالی کا چوبارہ ایک مستطیل کمرے اس کے سامنے تقریباً اسی سائز کے برامدے اور برامدے سے ذرا سے بڑے صحن پر مشتمل تھا۔ برامدے اور صحن کے رقبے پر شطرنجی ٹائیلوں کا فرش تھا۔ صحن کی بازار والی سائیڈ سرخ سیمنٹ کی تھی جس میں دس بارہ آدمیوں کے بیٹھنے کی ایک نشست گاہ تھی۔ سرخ سیمنٹ کی اسی نشست گاہ میں بیٹھے آدمی ذرا سی گردن گھما کر نیچے بازار میں دیکھ سکتے تھے اور بازار سے گزرنے والا شخص ذرا سی نگاہ اٹھا کر اوپر بیٹھے ہوئے آدمیوں کی سریاں دیکھ سکتا تھا۔ برامدے کے کونے میں پانی سے بھرا ایک نمناک گھڑا تھا جس کے گلے میں چنبیلی کے نازک نازک پھولوں کا ایک ہار تھا۔ ساتھ ہی ایک چھوٹی سی تپائی پر مٹی کی ایک کوری کنالی میں شیشے کا گلاس اوندھا رکھا ہوا تھا اور کنالی چنبیلی کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ماسٹر بالی کمرے سے برآمد ہوئے' ان کے ہاتھ میں نیلے رنگ کا ایک ربن تھا اور دوسرے ہاتھ کی مٹھی بند تھی۔ ان کے آنے پر میں مونڈھے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی مٹھی کھول کر جارج ششم کا ایک قدرے میلا سا روپیہ میری طرف بڑھا کر کہا "صاحبزادے یہ آپ کا روپیہ ہے"..... میں نے روپیہ ان کے ہاتھ سے لے لیا اور اسی طرح کھڑا رہا۔ وہ اپنی چارپائی پر بیٹھ کر کلارنٹ کیس پر نیلا ربن باندھنے لگے اور میں اپنی جگہ پر بدستور کھڑا رہا۔

انہوں نے نگاہیں اوپر اٹھائے بغیر دھیمے سروں میں کہا "بیٹھو صاحبزادے' بیٹھو" تو میں نے حوصلہ کر کے اپنے دائیں ہاتھ کے نیچے بایاں ہاتھ رکھ کر وہ روپیہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے ہولے سے کہا "مجھے اپنا شاگرد کر لیں" وہ میرے رویے کی اس اچانک تبدیلی پر حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگے اور ہنس کر بولے "شاگرد! آپ کو او کس لیے؟"

میں نے کہا "میں بانسری بجانا چاہتا ہوں اور آپ کی شاگردی میں آنے کا خواہشمند ہوں۔"

"ناں بھائی ناں" انہوں نے نفی کے انداز میں اپنا ہاتھ ہلایا اور خوشگوار لہجے میں بولے "میں استادی شاگردی نہیں کرتا۔ ناں میرے میں اتنی قابلیت ہے کہ کسی کو اپنا شاگرد

بناؤں۔ یہ تو بس ایسے کھیل تماشا ہے۔ تمہاری مہربانی۔"

میں آگے بڑھ کر ان کی چارپائی کے پاس زمین پر بیٹھ گیا اور لجاجت سے بولا "آپ میں قابلیت ہو یا نہ ہو' یہ سب کھیل تماشا ہو یا نہ ہو' میں آپ کی شاگردی میں آنا چاہتا ہوں اور آپ کا شاگرد ہو کر رہنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے کہا "تم ایک معزز گھرانے کے فرزند ہو اور یہ کسب مانگت لوگوں کا ہے۔ تمہارے گھر والے یہ کس طرح برداشت کریں گے کہ ان کا بیٹا فقیر ہو جائے اور کوک فریاد کرنے لگے۔ اس خیال کو دل سے نکال دو اور پڑھو لکھو۔ بڑے افسر بنو۔ ماں باپ کا نام روشن کرو اور اس شہر کی عزت بناؤ کہ ہم بھی کہہ سکیں ہمارے تخت پور کا بیٹا ڈپٹی کمشنر لگا ہوا ہے۔"

میں نے کہا "صاحب میرے میں ڈپٹی کمشنر بھی ہو جاؤں گا اور ماں باپ کا نام بھی روشن کر لوں گا' لیکن میں آپ کا شاگرد بن کر بھی رہنا چاہوں گا' مجھے قبول فرمائیے۔"

انہوں نے کہا "تم بانسری کیوں بجانا چاہتے ہو؟"

"اس لیے کہ بانسری کی آواز مجھے اچھی لگتی ہے۔"

"اگر تم کو بانسری سے بھی اچھی کوئی اور آواز مل گئی تو کیا بانسری چھوڑ دو گے؟"

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

کہنے لگے "اگر اپنے محبوب سے کوئی اچھا چہرہ نظر آ گیا تو محبوب کو چھوڑ دو گے۔ اپنے دین دھرم سے کوئی اچھا دین دھرم مل گیا تو اپنے دین کو چھوڑ دو گے؟"

میں اسی طرح بے جواب اور بے کلام' نگھرا سا فرش پر بیٹھا رہا تو انہوں نے روپیہ میرے ہاتھ کے کوزے سے اٹھا لیا اور کہا "استادی شاگردی کوئی نہیں' آج سے تم میرے چھوٹے بھائی ہو اور جب تک ہم دونوں میں سے کوئی بھی موجود ہے تم میرے بھائی ہی رہو گے۔" میں نے ان کا ہاتھ اپنی مٹھیوں میں بھینچ کر چہرے سے لگا لیا اور میرا رونا نکل گیا!

پیتل کی وہ بانسری جس پر میں نے دو تین دھنیں پکی کی ہوئی تھیں وہ میرے استاد کو پسند نہ آئی۔ دراصل انہیں میرے بجانے کا انداز اور میری کارکردگی مناسب معلوم نہ ہوئی اور انہوں نے مجھے یہ کہہ کر روک دیا کہ جب تک صحیح قسم کی بانسری نہیں ملتی مشق جاری نہیں کرائی جا سکتی اور جب تک مشق جاری نہیں ہوتی اس وقت تک صرف میل جول اور بات چیت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور میں شام پانچ کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ کبھی

WWW.PAKS

کبھی ان کے پاس کوئی ایسا آدمی بھی نظر آجاتا جس سے میں بالکل ناواقف ہوتا۔ وہ اس کے ساتھ میرا تعارف نہیں کراتے تھے' البتہ باتوں میں خود ہی کھل جاتا تھا کہ کون آدمی ہے اور کس غرض سے آیا ہے۔ ان لوگوں میں بیشتر لوگ اہل حرفہ ہوتے تھے۔ کوئی ترخان کوئی جولاہا' کوئی کمہار اور کوئی گانے بجانے والا جو کسی راگ راگنی کا الٹ پھیر سمجھنے کیلئے ان کے پاس آتا تھا۔ گوردوارہ صاحب کے نیلی پگڑیوں والے اکالی اور پٹی جوڑی بجانے والے راگی تقریباً ہر روز ہی وہاں آتے تھے اور شبد کیرتن کے بارے میں ان سے رائے لیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کی آپس کی باتیں میرے لئے بڑی مفید ہوتیں اور راگ ودیا کی سمجھ بوجھ میں بہت مدد دیتیں۔

ماسٹر صاحب مجھے "صاحبزادہ" کہہ کر بلاتے تھے اور مجھے اس تخاطب سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ ایک روز میں نے جرأت کر کے ان سے کہہ ہی دیا کہ اس خطاب سے مجھے بڑی ندامت ہوتی ہے اس لیے مجھے میرا نام لے کر بلایا کریں تو انہوں نے مسکرا کر کہا" بھئی تمہارا نام اتنا بے وزن اور بے سرا ہے کہ ہم سے پکارا نہیں جاتا۔" میں نے کہا' آپ جس نام سے مجھے پکارنا چاہیں وہی میرا اصل نام ہوگا۔"

کہنے لگے "پھر ٹھیک ہے' اپنا پہلا اور آخری حرف چھوڑ دو۔ میں تمہیں شفا کے نام سے بلایا کروں گا۔" میرے لئے اس سے اچھا اور کیا نام ہو سکتا تھا' بخوشی منظور کر لیا اور اپنے آپ کو شفا ہی سمجھنے لگا۔ تھوڑے دنوں بعد جب ان کے ملنے ملانے والوں نے میرے نام کو ندائیہ صورت دی تو میں شفائی کہلانے لگا۔ لیکن میرا یہ نام صرف ان کی محفل تک محدود تھا۔ میرے گھر والوں یا شہر کے لوگوں کو اس تبدیلی نام کا کوئی علم نہ تھا۔

لوگوں کی محفل میں میں ماسٹر صاحب کو "جناب" کہہ کر مخاطب کرتا۔ اکیلے ہوتے تو میں "سرکار" کہہ کر بلاتا اور جب کسی کیفیت کا عالم ہوتا تو میرے منہ سے بے اختیار "مہراج" نکل جاتا۔

سیالکوٹ سے چھ چابیوں والی بوزی کی پکلو فلوٹ پہنچ چکی تھی اور میں نے باقاعدگی سے اس پر سرگم کی پریکٹس شروع کر دی تھی۔ ایک مہینہ گزرنے کے باوجود اور لگن دھیان کی پریکٹس کے باوصف انہوں نے مجھے آگے کوئی سبق نہ دیا۔ البتہ ان کی غیر موجودگی میں چوری چوری میں کچھ ایسی خود ساختہ بندشیں بجانے لگا تھا جو مجھے بڑا لطف دیتیں اور میں اپنے آپ کو داد دیتے ہوئے خود ہی سر دھنا کرتا۔ ایک روز انہوں نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے رک کر کوئی ایسی ہی بندش سنی تو اوپر آکر فرمایا" شفائی! یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے ٹھیک

نہیں اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

میرے اوسان خطا ہو گئے اور اپنی چوری پکڑے جانے پر میں پتھر کی مورت بن گیا!

انہوں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اپنا کلارنٹ اٹھایا اور ایک زمزمہ لے کر سرگم بجانی شروع کر دی۔ میں سمجھا یہ میرے لیے سنگت کا حکم ہے۔ پکھو ہونٹوں سے لگا کر میں نے بھی سرگم میں ساتھ دینا شروع کیا تو انہوں نے سر کے اشارے سے روک دیا۔ تھوڑی دیر سرگم کے الٹ پھیر کے بعد انہوں نے ہاتھ میری طرف بڑھایا اور کلارنٹ پکڑا کر بولے "اسے بجاؤ اگر کچھ بجانا ہے تو۔ یہ فلوٹ وغیرہ واہیات ساز ہیں 'مصنوعی عشق بازی کے بہانے۔"

میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اتنا بڑا ساز' ٹیڑھی سیدھی چابیاں' استادوں کا ورثہ' گورو کا ناد۔ میں اسے کس طرح اپنا سکتا ہوں۔ ساری عمر بھی ریاض کروں تب بھی سرگم کے جال سے نہیں نکل سکتا۔ یہ تو جل دیوتا کا ساز ہے جو آدھی رات کو سمندر سے نکل کر بجاتے ہیں اور پھر آخری سروں کے ساتھ سمندر ہی میں ڈوب جاتے ہیں۔ میں اسے کدھر سے بجالوں گا! اور میں وہ پھونک کہاں سے لاؤں گا جو مرنے اور جینے کے درمیان ہوتی ہے اور خود ہی فیصلہ کرتی جاتی ہے کہ کلارنٹ نواز کو جینا ہے کہ مرنا ہے۔ کلارنٹ کو ہاتھ سے چھوٹ کے گرنا ہے یا پھر سے ٹوٹے ہو کر کیس میں بند ہونا ہے۔ میں مہراج کا کلارنٹ ہاتھوں میں لئے بیٹھا تھا اور مہراج چارپائی پر بیٹھے میری طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔

ماسٹر صاحب کا معمول تھا کہ سردیاں گرمیاں فجر سے پہلے منہ اندھیرے اٹھ کر اپنے صحن میں آ کھڑے ہوتے اور گوردوارہ صاحب کے کلس کی طرف منہ کر کے کلارنٹ پر آسا کی وار بجاتے۔ بازار کا خاموش اور چپ چاپ چوک دار کی آنس دینے لگتا اور ساری خاموش فضا اس آواز سے لبریز ہو جاتی۔ ہرنام سنگھ سوڈھی جو ہمارے علاقے کے بہت بڑے بلکہ سب سے بڑے زمیندار تھے اپنی ریڑھی میں سوار ہو کر اس آواز سے بہت پہلے چوک میں پہنچ جاتے۔ ان کا ملازم جسا سوڈھی صاحب کی ریڑھی آہستہ آہستہ حویلی سے دھکیلتا ہوا چوک میں لے آتا اور دکان کے پھٹے پر بیٹھ جاتا۔ سردار صاحب پچھلے دس سال سے فالج کے مریض تھے اور سوائے اس ایک وقت کے اپنی حویلی سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ جب تک کلارنٹ بجتا رہتا سردار صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی ان کی داڑھی اور گلے کے صافے کو بھگوتی رہتی۔ ان کے بچوں پوتوں اور نواسوں نے کئی مرتبہ کہا کہ وہ شدید گرمی اور سردی میں اسی طرح باہر نکل کر چوک میں نہ جایا کریں جب ضرورت پڑے ماسٹر بالی کو حویلی پر بلا کر

آسا کی وار سن لیا کریں لیکن سوڈھی صاحب نہیں مانتے تھے۔ خود ماسٹر صاحب نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی تھی کہ آپ بزرگ ہیں اور بزرگوں کی سیوا ہمارا دھرم ہے میں حویلی میں آکر وار سنا جایا کروں گا' لیکن سوڈھی صاحب نے ان کی درخواست یہ کہہ کر ٹال دی تھی کہ تھوڑی دیر کو میں کھلی ہوا میں نکل کر واہگرو کے موسم کا نظارہ کر لیتا ہوں مجھے آنے ہی دو۔

اندھیرے چوک میں سوڈھی ہرنام سنگھ کی ریڑھی آجانے پر ماسٹر صاحب کو بھی علم ہو جاتا اور وہ کلارنٹ کی لے اور اونچی کر دیتے۔ کئی مرتبہ یہ وار سن کر سردار صاحب کی سسکیاں اتنی اونچی ہو جاتیں کہ وہ وار کی آنس دیتے ہوئے چوک کے ساتھ جھگڑا کرنے لگتیں اور ان کے درمیان گہری نوک جھونک ہوتی۔ جسا اپنی افیون کی جھوک میں اسی طرح پھٹے پر گچھا مچھا پڑا رہتا اور سردار صاحب کی "داڑھی لوگڑ کی طرح بھیگتی رہتی۔ کئی مرتبہ وہ اپنی سسکیوں کے درمیان جسے کو ہلکی ہلکی آوازیں دے کر بلاتے کہ "لے یہ ماسٹر بالی کو دے آ۔" "اٹھ جنایہ بالی کو بھینٹ کر آ" پر جسے کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ ہوتا اور وہ پل پر پڑی خچر کی طرح ناک اور نتھنوں سے آوازیں نکالے جاتا۔ مجھے یہ سب اس لیے معلوم ہے کہ صبح سویرے میں بھی چوک میں جانے لگا تھا اور قریب ہی لالہ رام چند صراف کے پھٹے پر بیٹھ کر آسا کی وار سننے لگا تھا۔ اس وار کے آخر میں سرکار کچھ سریں ایسی لگاتے تھے جو میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ جوڑ توراگ کے اندر لگتا تھا پر سرتیاں کچھ باہر کی ہوتی تھیں' جیسے زمین پر چلتے چلتے کوئی سواری ہوا میں اڑنے لگے اور ہلکی سی بڑھت کے بعد پھر زمین پر لینڈ کر جائے۔ یہ بات پوچھنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں تھا پر جاننے کیلئے ہر وقت بے چین رہتا تھا۔

مستری دان سنگھ میرے صاحب کا بڑا اچھا یار تھا۔ منہ پھٹ کافی اجڈ' غلیظ گفتگو کا رسیا۔ علم سے کورا اور راہ چلتوں سے ٹھٹھول کرنے کا عادی۔ لیکن حالات حاضرہ پر ایسے اچھے کمنٹ جوڑتا تھا کہ جس دکان پر جا کر بیٹھتا لوگوں کے ٹھٹھ لگ جاتے اور سننے والے تالیاں بجا بجا کر اس کے کمنٹوں کی تان اٹھاتے۔ کلارنٹ کو وہ پھونکنی کہتا تھا۔ جب بھی ماسٹر صاحب کے چوبارے پر آتا سب سے پہلے یہی پوچھتا "او بھئی۔ کدھر ہے تیری پھونکنی۔ ایک دو پھونکیں مار کر ہمارے سینے کی انگیٹھی بھی سلگا دے' ایک پراٹھا ہم بھی سینک لیں۔" ماسٹر صاحب اس کی باتیں سن کر بہت خوش ہوتے اور اس کے لئے نیچے سے سوڈا واٹر ضرور منگواتے۔ مستری دان سنگھ گرمی سردی ایک کچھا اور ایک لمبا کرتہ پہن کر گھوما کرتا۔ پاؤں میں

بغیر تسموں کے فلیٹ بوٹ اور سر پر پگڑی کے بجائے ہاتھ بھر لمبا صافہ۔ سر کا جوڑا ہمیشہ ڈھیلا اور گردن کے کیس کھلے۔ بدن سے کبھی ٹاہلی کی خوشبو آتی کبھی دیار کی۔ جب کاٹھ کا کام نہ کر رہا ہوتا تو جسم سے کچے گارے کی بھبک آیا کرتی جیسے کوئی کو ٹھا لیپ پوت کر ابھی اٹھا لایا گیا ہو۔ اپنی بیوی ہردئی سے بہت ڈرتا تھا جو اس کو ڈوئی سے اور چمٹے سے مارتی اور گھر سے باہر نکال کر اندر سے دروازہ بند کر لیتی تھی۔ دو تین مرتبہ ہردئی نے ڈانگ لے کر خوب اس کی ہڈیاں سینکی تھیں لیکن زخموں چوٹوں کی تاب نہ لا کر زندہ بچ گیا اور معافی مانگ کر پھر اپنے گھر چلا گیا۔ اصل میں مستری دان سنگھ ٹھکر کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اپنے اڈے کے سامنے سے گزرتی ہوئی عورتوں پر ایسا ذومعنی فقرہ کستا کہ وہ دو ہتڑ مارتی سیاپا کرتیں ہردئی کے پاس شکایت لے کر آتیں۔ ہردئی بات کی تحقیق کیے بغیر سوٹا لے کر اندر سے نکلتی اور کام پر بیٹھے مستری کی ہڈیاں توڑنے لگتی۔ وہ اٹھ کر بھاگتا تو ہردئی لاریوں کے اڈے تک اس کا پیچھا کرتی اور آستینیں چڑھا کر جو کچھ اس کے منہ میں آتا بکے جاتی۔ لوگ اکٹھے ہو کر ہردئی کا کلیان سنتے اور تالیاں بجا بجا کر "شاوا تائی۔ شاوا تائی" کے نعرے مارتے۔ اس مارا ماری اور زورا زوری میں ایک مرتبہ مستری دان سنگھ پر قتل کا مقدمہ بھی بن گیا تھا اور دو تین سال سیشن سپردگی کی قید کاٹ کر بڑی مشکل سے رہا ہوا۔ اس خوفناک مقدمے سے دان سنگھ کی رہائی بھی میرے صاحب کی بدولت ہوئی تھی اور وہی اُس کو چھڑا کر لائے تھے۔

ہوا یوں تھا کہ ایک مرتبہ مستری دان سنگھ نے گھریلو جھگڑوں سے تنگ آ کر اور ہردئی کے ہاتھوں بھرے بازار میں ذلیل ہونے کے بعد خودکشی کا پروگرام بنایا اور گلے میں رسہ ڈال کر پھانسی لینے کے سارے انتظامات مکمل کر لئے۔ ایک روز جب ہردئی دربار صاحب ماتھا ٹیکنے گئی ہوئی تھی مستری دان سنگھ نے اپنے اوزاروں والے صندوق سے پھانسی کا موٹا رسہ نکالا اور اسے اپنے کوٹھے کے بڑے شہتیر میں ڈال کر پہلے تو دو جھونٹے لے کر اس کی مضبوطی کا معائنہ کیا پھر سٹول پر چڑھ کر اس میں گول پھندے کی گانٹھ ڈالی۔ ساتھ ہی ایک چھوٹے رسے کے سرے کو پھندے کے ساتھ اس طرح پیوست کیا کہ گردن پر کھینچ نہ پڑے اور وجود آرام کے ساتھ لٹکا رہے۔ دیکھنے والوں کو یوں لگے کہ پھانسی لگ چکی ہے پر لٹکا ہوا وجود مزے سے سانس لیتا رہے اور آنکھوں کی جھری میں سے حالات کا جائزہ لیتا جائے۔

مستری دان سنگھ بڑا کاریگر اور مکینکل ذہن کا آدمی تھا۔ اپنے محفوظ پھندے میں دو مرتبہ گردن ڈال کر اس نے ٹرائی لی اور کامیابی کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ اسے یقین تھا کہ جونہی

WWW.PAKS

ہردئی دربار صاحب سے واپس آکر کوٹھے کا دروازہ کھولے گی پہلے ایک زور کی چیخ مارے گی پھر اونچے اونچے بین کرنا شروع کردے گی۔ لوگ اس کے بین سن کر اس کے گھر کی طرف بھاگیں گے اور دور دور کر اور اپنے گھر والے کی لاش کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کہے گی "مجھے کیا پتا تھا دان سنگھا کہ تو اتنا بڑا فیصلہ کرلے گا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تو میرے دکھوں کے ہاتھوں جان دے دے گا۔ میری اپنی کرنی سے مارا جائے گا۔ میرے ظلم سے شہید ہو جائے گا۔ دے میرے سوہنے بادشاہا۔ میرے راٹھا' میرے دریا میاں۔ آخری باری مجھے معافی تو دیتا جا میرے قصور تو معاف کرتا جا....." پھر وہ بیہوش ہو کر گر پڑے گی اور عورتیں اسے پنکھا جھلتے ہوئے منہ پر ٹھنڈے پانی کے تڑے دینے لگیں گی۔ لوگ داتری سے رسہ کاٹ کر میری لوتھ زمین پر اتاریں گے' کچھ پنڈے کی مالش شروع کردیں گے کچھ ڈاکٹر کی طرف بھاگیں گے اور باقی کے ہردئی کو تسلی دینے میں لگ جائیں گے.....

جب ہردئی کے گوردوارہ صاحب سے واپس آنے کا وقت قریب آیا تو دان سنگھ واہگرو کا نام لے کر پھانسی کے پھندے سے لٹک گیا اور لات مار کو سٹول پرے گرادیا۔ ابھی اسے پھانسی پر لٹکے ڈیڑھ دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہردئی کی جگری دوست کرپو اپنی سہیلی کو آوازیں دیتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ جب کرپو نے بھاپاجی کی "لاش" کو رسے سے لٹکے دیکھا تو اس نے زور کی ایک چیخ ماری اور باہر بھاگ گئی۔ باہر جاکر کرپو نے نہ تو کوئی واویلا کیا اور نہ ہی دوسری چیخ مار کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ آرام سے پھر کوٹھے کے اندر گئی اور بھاپاجی کی لاش کو دیکھنے لگی۔ بھاپاجی کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ کمر پر رسی سے بندھے تھے اور دونوں ٹانگیں چمٹے کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ سرخ سرخ آنکھوں کے ڈھیلے اوپر کو چڑھ گئے تھے اور بھاپاجی کے ہونٹوں پر جھاگ کا ایک چھوٹا سا پھوہا سوکھ گیا تھا۔

کرپو نے جلدی جلدی ہردئی کا سامان اٹھانا شروع کردیا۔ شیشے کا جگ' الماری میں رکھی ہوئی تلے دانی' پیسوں والی پٹاری اور بادام روغن نکالنے والی مشین۔ یہ ساری چیزیں جمع کرکے جب وہ فرش پر چادر بچھا کر ان کی گٹھڑی باندھ رہی تھی تو مستری دان سنگھ کو پھانسی پر لٹکے لٹکے بڑا غصہ آیا۔ اس نے گٹھڑی باندھتی کرپو کے چوتڑوں پر زور کا ایک ٹھڈا مارا اور ساتھ ہی اونچی آواز میں ماں کی گالی دی۔ لاش سے ٹھڈا کھا کر اور ماں کی گالی سن کر کرپو اوندھے منہ فرش پر گری اور اس نے وہیں پر ان دے دیئے۔ تھانے والے مستری دان سنگھ کو گرفتار کرکے لے گئے اور اس پر کرپو کے قتل کا مقدمہ بن گیا۔

OCIETY.COM

۲

گرمیوں کی ایک تپتی دوپہر میں پرانی منصفی کے پاس کھجور والی گلی کے دہانے پر ایک نوجوان لڑکی نے میرا راستہ روک کر کہا "ویر میرا ایک کام کردے گا۔"

میں اس لڑکی کے قدبت، شکل و صورت اور موہنی چھب کو دیکھ کر سکتے میں آگیا اور اس کے سامنے بیوقوفوں کی طرح ہکلانے لگا۔ اس نے پھر بڑی لجاجت سے کہا "میری بات مانے گا۔"

میں نے منہ پکا کر کے کہا "کیا بات ہے بی بی؟"

کہنے لگی "مجھے ماسٹر بالی سے ملادے گا۔"

اپنے استاد کا نام اس خوبصورت لڑکی کے منہ سے مجھے میٹھا میٹھا سا لگا اور میں نے اعتماد بھرے لہجے میں کہا "کیوں نہیں ضرور ملادوں گا، وہ تو ہر ایک سے مل لیتے ہیں۔"

اس نے کہا "میں پنڈت شنکر داس کی بیٹی ہوں اور میرا نام رجنی ہے۔ میں نے دیپو کے بیاہ میں ماسٹر جی کو باجہ بجاتے دیکھا تھا اور ان کو پرنام بھی کیا تھا لیکن انہوں نے میرے پرنام کا جواب صرف سر ہلا کر دیا تھا کوئی بات نہیں کی تھی۔ تو میری ان سے بات کرادے گا؟"

میں نے کہا "میں بات تو کرادوں گا پر تجھے یہ کیسے پتہ ہے کہ میں ان کو جانتا ہوں۔"

کہنے لگی "میں نے تم کو اکثر ان کے پاس آتے جاتے اور ان کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا ہے۔ تم ان سے باجہ بجانا سیکھتے ہو؟"

"باجہ نہیں" میں نے چڑ کر کہا "میں ان سے کلارنٹ سیکھتا ہوں۔ وہ باجہ نہیں بجاتے کلارنٹ بجاتے ہیں۔" رجنی اپنی غلطی پر شرمندہ سی ہو گئی۔

میں نے کہا "تم کب ان سے ملنا چاہتی ہو؟"

کہنے لگی "جب بھی وہ ملنا پسند کریں۔"

WWW.PAKS

"ان کے چوبارے میں آسکتی ہو؟"

"بازار میں آنا تو میرے لیے مشکل ہے البتہ انہیں کسی اور جگہ ضرور مل سکتی ہوں۔"

"کسی اور جگہ وہ آنا پسند نہیں کریں گے۔"

"تو پھر جو نسی جگہ وہ پسند کریں وہاں آسکتی ہوں۔"

"تمہارے گھر والے تو ناراض نہیں ہوں گے۔"

"وہ تو ضرور ناراض ہوں گے اور اگر انہیں پتہ چل گیا تو میرا گھر سے نکلنا بھی بند کر دیں گے۔"

"پھر تو مشکل ہے۔"

"کیوں؟ مشکل کیوں ہے؟"

"مشکل اس لیے کہ شاید سرکار بھی اس کو پسند نہ کریں۔"

"اسی لئے تو میں نے تمہارے آگے واسطہ ڈالا ہے۔ تم چاہو گے تو سرکار ضرور پسند کرلیں گے۔"

میں نے کہا "میں پکا وعدہ نہیں کرتا البتہ کوشش ضرور کروں گا..... لیکن تم ان سے مل کر کیا کرو گی؟"

"میں ان کو دیکھوں گی۔"

"کوئی بات نہیں کرو گی؟"

"نہیں"

"پھر کیا فائدہ! دیکھ تو انہیں تم کہیں بھی سکتی ہو۔"

"اس دیکھنے اور اس دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔ میں انہیں پاس سے دیکھنا چاہتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور سر جھکا کر اپنے پاؤں دیکھنے لگی جس میں مہین سٹریپ والی سلیپر سی چپلی سی تھی اور انگوٹھوں کے پاس سرسوں کے پھولوں جیسے اون کے دو پھمن تھے۔ جب ادھر سے کرم دین کمہار اپنے گدھے پر نمودار ہوا تو وہ ہولے سے نمستے کہہ کر آگے کو روانہ ہو گئی۔

میں رات بھر دیوار سے ڈھولگا کر اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا جس کو کئی سال پہلے میں نے سکول سے آتے جاتے دیکھا تھا لیکن اس کے بارے میں کبھی سوچا نہ تھا۔ کسی سے گفتگو کرنے کے بعد آدمی اس کے بارے میں سوچنے بھی لگ جاتا ہے اور سوچ گفتگو سے

OCIETY.COM

بہت آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس میں ایسی ایسی باتیں آجاتی ہیں جو لمبی لمبی کہانیوں سے بھی طویل ہوتی ہیں اور جن پر سے رسے کے پلوں کی طرح سے گزرا جاسکتا ہے۔ نیچے خوفناک چٹانوں والے گہرے گہرے' شور مچاتے جھاگ اڑاتے دریا ہوتے ہیں اور گزرنے کے لئے ایک رسہ پاؤں کے نیچے اور دوسرا ہاتھ سے پکڑنے کیلئے ہوتا ہے۔

میرا خیال تھا رجنی کو مجھ سے عشق ہو گیا ہے اور اس نے ماسٹر صاحب کا بہانہ ڈال کر مجھ سے تعلقات بڑھانے کی راہ نکالی ہے۔ اس کے پتاجی میرے ابا جی کو بہت اچھی طرح جانتے تھے اور دونوں ہندوستان کی آزادی کے بارے میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کیا کرتے تھے۔ پنڈت جی کشمیری پنڈت تھے اور نمدے پٹو کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کی عورتیں جب شام کو سیر کرنے کیلئے باہر نکلتیں تو شہر کے ویران علاقے بھی کشمیر بن جاتے۔ وہ دراز قد' بھرے ہوئے جسم' سیاہ آنکھوں اور گوری رنگت کی عورتیں تھیں لیکن رجنی ان سب میں خوبصورت تھی۔ اس کے ماتھے پر ایک عجیب طرح کی سرخی تھی جو شام کو اور بھی نمایاں ہو جاتی اور دن کے وقت ہلکی پیلی دھوپ کی طرح سر کے بالوں تک پہنچ جاتی۔ اگر کسی کو اس کے ماتھے پر گال رکھنے کا موقع میسر آتا تو اسے اس پیلی دھوپ سے زعفران کی خوشبو بھی ضرور آتی!

اس روز ماسٹر صاحب نے اپنی بندش کے جس ٹکڑے کا مجھے درس دیا وہ ٹکڑا کچھ اتنا اچھا نہیں تھا۔ جتنی باتیں انہوں نے کیں وہ ساری میری پہلے کی سنی ہوئی تھیں اور صبح کے وقت آسا کی جو دار انہوں نے بجائی اس میں رس کم تھا اور استادی زیادہ تھی۔ میں نے ان سے رجنی کی بات کرنا چاہی لیکن کسی نے میرا گلا دبوچ لیا اور میں ان سے بات کیے بغیر ہی واپس چلا آیا۔

جب سے میری رجنی سے ملاقات ہوئی تھی میرے دن اور رات' صبحیں اور شامیں تبدیل ہو گئی تھیں اور میری ٹیوشن میں رخنے پڑنے لگے تھے۔ میں نے پرانی منصفی کے پاس کیکروں سے دانتن توڑنے کے بہانے رجنی کی گلی کے چکر لگانا شروع کر دیئے تھے' لیکن اس کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کے گھر کے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا۔ دوسرے سبھی لوگ موجود تھے مگر رجنی نہیں تھی۔ شاید اس کے گھر والوں کو علم ہو گیا تھا اور انہوں نے اس کا باہر نکلنا بند کر دیا تھا' لیکن اگر سوچا جائے کہ گھر والوں کو کیا علم ہو گیا تھا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی ایسی بات ہی نہیں تھی جس پر شک گزرتا کہ کسی پر اس کی توجہ ہے یا کسی کے ساتھ میل ملاقات

WWW.PAKS

ہے یا کوئی اشارہ کنایہ ہے۔

دراصل میرے دل کے اندر ایک چور سا گھس گیا تھا جو نہ سامان اٹھا کر جاتا تھا اور نہ چوری کرنے پر آمادہ ہوتا تھا۔ میرے گھر کے اندر بیٹھا گھر کا ایک فرد سا بنتا جا رہا تھا اور مجھ پر حکم چلا رہا تھا۔ میں ڈر کے مارے کسی کو اطلاع بھی نہ کرتا تھا کہ میرے گھر کے اندر ایک چور گھس آیا ہے اور گھر کا مالک بن گیا ہے۔ نکال اس لیے نہ سکتا تھا کہ اس کے چلنے کے بعد گھر کے ویران ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ ایک عجیب طرح کی الجھن تھی جس نے مجھے بے حال کر دیا تھا اور میں خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ ماسٹر صاحب نے کئی مرتبہ مجھ سے اس ویرانی اور بے سروسامانی کا سبب پوچھا تو میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میرا ساز بجانے میں دل نہیں لگتا اور میں اس کام کو چھوڑ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا "ریاض کرنا چھوڑ دو لیکن ملنا ملانا تو رکھو۔ تم تو اب ملتے بھی نہیں ہو۔"

میرے لیے ایسے شخص سے ملنا ہی مشکل ہو گیا تھا جو میری راہ کا پتھر بن گیا تھا اور مجھی کو خوفزدہ کیے جا رہا تھا بھلا کوئی استاد اس طرح کا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے ہی شاگرد کی بساط لپیٹ کے کونے میں رکھ دے اور اسے ہونے سے نہ ہونا کر دے۔

رجنی مجھے اچھی ضرور لگی تھی لیکن میں اس کے عشق میں مبتلا نہیں تھا۔ پیاری پیاری ضرور تھی پر میری محبوب نہ تھی۔ بے شمار خوبیوں کی مالک تھی لیکن اس کا یہ عیب بہت بھیانک تھا کہ وہ ماسٹر صاحب سے ملنا چاہتی تھی۔ ملنے میں بھی شاید کوئی خرابی نہ تھی لیکن وہ ان کی داسی بن کر رہنا چاہتی۔ رہنا کیا چاہتی وہ اندر ہی اندر ان کی داسی بن چکی تھی۔ اب یہ کوئی اچھی بات تو نہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کا غلام بن جائے۔ اس کی پوجا کرنے لگے۔ اس کے ہاتھ میں اپنی ذات کی مہار پکڑا دے۔ آخر خودداری بھی تو کوئی چیز ہے۔ خودی کا بھی تو ایک مقام ہے۔ یہ کیا ہوا کہ انسان ہو کر دوسرے انسان کے آگے ماتھا ہی ٹیک دیا۔ اس کے آگے اپنا سب کچھ پامال کر دیا۔ آخر ایک حد ہوتی ہے!

جب میں دس بارہ روز تک ماسٹر صاحب کے چوبارے پر نہ گیا تو ایک روز وہ مجھے گھر ملنے آ گئے۔ میں نے انہیں گھر کے دروازے پر ہی یہ کہہ کر ٹلا دیا کہ میرے گھر والے اس میل ملاقات کو پسند نہیں کرتے جس روز مجھے ضرورت ہو گی 'میں خود آ جاؤں گا۔ وہ میرے اس رویے سے دل برداشتہ ہو کر واپس چلے گئے اور پھر مہینہ بھر میری ان سے ملاقات نہ ہوئی۔ ایک مرتبہ بازار میں ملے تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ اپنی راہ چلے گئے اور میں اپنے

گھر آگیا۔

لیکن کبھی یہ ہو سکتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے محبوب رقیب بن جائے اور راحت جاں کلفت جاں کا روپ اختیار کر لے۔ عشق بلا خیز کا ساگر سوکھ جائے اور زمین چیخ کر پپڑیوں میں تبدیل ہو جائے۔ ٹھنڈی نرم ہوا کے جھونکے لو دینے لگیں اور بدن کے اندر آبلے پڑ جائیں۔ ہنستے بستے گھر میں آہیں اور کراہیں داخل ہو کر سارے ماحول کو ماتم کدے میں تبدیل کر دیں! اگر پہلے اس طرح سے کبھی نہیں ہوا تو میرے ساتھ ضرور ہوا۔ حالانکہ رجنی سے نہ تو مجھے عشق تھا اور نہ میں اسے اچھی طرح سے جانتا ہی تھا۔

اپنے رویے پر نادم اور اپنے عمل سے شرمندہ جب ایک گہری شام میں رندھے ہوئے گلے اور ڈبڈبائی آنکھوں سے ماسٹر صاحب کی سیڑھیاں چڑھا تو رجنی میرے والے مونڈھے پر بیٹھی ماسٹر صاحب سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے مہک رہا تھا اور سارا وجود تپسیا میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر چہک کے بولی "ویر جی آپ نے تو اپنا وچن پورا نہ کیا' آج میں ہمت کر کے خود ہی آ گئی۔"

میں نے کہا "میں ماسٹر صاحب سے بات کرنے والا ہی تھا لیکن تم نے مجھے مہلت ہی نہیں دی۔"

مہلت کا لفظ سن کر وہ خوب ہنسی اور مٹھار کر بولی "آپ کی مہلت میں تو چاہے بندا مر ہی جائے۔ اتنی لمبی مہلت" ماسٹر صاحب نے کہا "یہ بادشاہ آدمی ہے اور بادشاہوں کی مہلتیں لمبی ہی ہوا کرتی ہیں۔" پھر انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے مجھے بیٹھنے کیلئے کہا لیکن میں بیٹھا نہیں اسی طرح کھڑا رہا۔

رجنی کہنے لگی "سرکار ہم دونوں کا کمپی ٹیشن ہے آج گورو پریم میں یہ بڑھا ہوا ہے کل میں اس سے بڑھ جاؤں گی۔" ماسٹر صاحب دھیرے سے بولے "پریم کا دعویٰ وہ کرے جسے باقی رہنا ہو۔ یہ سب تو بس کھیل تماشا ہے۔ کھیل کھیلے' تماشا کیا اور چلے گئے۔"

رجنی نے کہا "کھیل بھی کوئی کوئی ہی کھیل سکتا ہے۔ گورو جی اور تماشا کرنا تو بہت ہی مشکل بات ہے۔ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔"

اس کی یہ فلسفیانہ بات سن کر میں چڑ سا گیا اور ضد میں آ کر بولا "ہر کوئی تماشا کر سکتا ہے' یہ کونسی مشکل بات ہے۔" اور جب میں جانے کیلئے پلٹا تو میری طرف دیکھ کر بولی "ویر جی مجھے ساتھ لے کر اترنا۔ اکیلے جاتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

WWW.PAKS

"اکیلے آتے ہوئے ڈر نہیں لگا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں"

"پھر چلی بھی اسی طرح جانا راستے میں کونسا سمندر پڑتا ہے۔"

"ٹھیک ہے" اس نے بے پروائی سے جواب دیا اور ماسٹر صاحب نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر نہ کوئی خوف تھا نہ ملال۔ نہ ہی ان کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ کوئی سیڑھیاں چڑھ آئے گا تو کیا کہے گا۔ اٹھے اور اٹھ کر اندر سے لاکھ کا ایک کنگن نکال لائے۔ رجنی کو دے کر بولے "تم پہلی دفعہ آئی ہو تمہارے لئے کوئی سوغات تو ہونی چاہیے۔"

رجنی نے کنگن لے کر پہلے تو ماتھے سے لگایا' پھر چوما اور آنکھوں سے لگا کر بولی "یہ تو ماتھے کا جھومر ہے ہاتھ میں تو نہیں پہنوں گی۔"

ماسٹر صاحب نے مسکرا کر کہا "کچھ بھی نہیں' فقیروں کا کڑا ہے۔ کڑا بھی کیا بس کھیل تماشا ہے۔ پہننے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

میں ماسٹر صاحب کو ہاتھ سے بھونڈے سے سلام کا اشارہ کر کے سیڑھیاں اتر گیا۔ نیچے لچھو اپنی دکان بڑھا رہا تھا اور پھٹے جوڑ کر دروازہ بند کر رہا تھا۔

OCIETY.COM

۳

اب مجھ پر اخلاقیات کا بھوت سوار ہو گیا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ رجنی جو ایک عالی نسب اور مہا پنڈت گھرانے کی لڑکی تھی اس طرح خراب و خوار ہوتی پھرے اور ایک بھنگی کے عشق میں مبتلا ہو جائے۔ مجھے ماسٹر بالی سے زیادہ اس احمق لڑکی پر غصہ آتا تھا جو اپنے پریوار اور لوک لاج کی پروا کئے بغیر منہ اٹھا کر چوبارے پر آ گئی تھی اور بے فکری سے ایسے باتیں کر رہی تھی جیسے اپنی موسی کے گھر بیٹھی ہو۔

رات بھر میں انگاروں پر لوٹتا رہا اور اٹھ اٹھ کر پانی پیتا رہا۔ اگر وہ میرے گھرانے کی لڑکی ہوتی تو اب تک میں نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا لیکن وہ ایک غیر ذات اور غیر گھرانے کی لڑکی تھی اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کا گلا گھونٹنے کے بجائے اس کے گھر والوں کو اطلاع کر دی جائے اور ان کی ہر طرح سے مدد کی جائے۔

میں نے کتابوں میں پڑھا تھا اور اپنے بزرگوں سے بھی یہی سنا تھا کہ مصیبت کے وقت دوسروں کی مدد کرنی چاہیے اور مشکل میں ان کے کام آنا چاہیے۔ ہمارے شہر میں دوسروں کی بروقت مدد کرنے والے اور بھی بہت سے لوگ تھے جن کا زیادہ تر یہی کام تھا کہ وہ لوگوں کو آنے والی مصیبتوں سے آگاہ کرتے رہتے اور ان کے گھریلو مسائل سلجھاتے رہتے۔ یوں تو ہمارے قصبے میں چھ سات وکیل بھی تھے' لیکن وہ فیس لے کر مسائل سلجھایا کرتے اور ان کی فیس کافی زیادہ ہوتی' پر وہ لوگ جو بغیر فیس کے یہ ڈیوٹی سرانجام دیتے' ان کے مقام وکیلوں سے بلند تھے اور ان کے درجے عام آدمیوں سے اونچے تھے۔ آدھا قصبہ ان کی وجہ سے عذاب میں مبتلا تھا!

جب میں نے رجنی کے گھر جا کر اس کی ماں سے اس گھمبیر صورتحال کا ذکر کیا تو اس نے ہاتھ باندھ کر کہا" تو میرے بیٹوں جیسا ہے اور مجھے انہی کی طرح پیارا ہے اس کا تذکرہ کسی اور

WWW.PAKS

سے نہ کرنا نہ ہی پنڈت جی کو بتانا میں یہ سارا کام خود سنبھال لوں گی۔" جب میں وعدہ کر کے چلنے لگا تو اس نے میرے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا "اگر پھر کبھی رجنی ادھر جائے تو فوراً آ کر مجھے اطلاع کرنا اور اطلاع کرنے کیلئے کوئی بہانہ بنا کر آنا۔" میں نے سچے دل سے درگا ماسی سے اس نیک کام کی ہامی بھر لی اور اپنے گھر چلا آیا۔ میرے سینے سے پہاڑ جیسا بوجھ کم ہو گیا تھا اور میں ایک انجانی خوشی سے ابابیل کی طرح فضاؤں میں تیرنے لگا تھا۔ کبھی کبھی کچھ نیک کام انسان سے ایسے بھی سرانجام ہو جاتے ہیں کہ اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس کے لئے جنت کا ایک دروازہ کھل گیا ہے اور اندر سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے۔

اس ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے پیچھے گرمیوں کی چھٹیاں تیزی سے گزر رہی تھیں اور میرے کالج جانے کا وقت قریب سے قریب تر آ رہا تھا۔ ماسٹر صاحب سے سبق لینے اب میں نے پھر باقاعدگی سے جانا شروع کر دیا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے سبق میں کوئی دلچسپی تھی یا ماسٹر صاحب مجھے اچھے لگتے تھے بلکہ صرف اس لیے کہ میں درگا ماسی سے اپنے وعدے کا پالن کرنا چاہتا تھا اور اپنے وچن پر سختی سے قائم تھا۔

ایک مرتبہ جب ماسٹر صاحب نے قدرے ترشی سے کہا کہ ساز کی سکھلائی دونی کا پہاڑا نہیں ہے کہ آگے پیچھے جھوم کر دو تین دن میں یاد کر لیا۔ اس کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے اور ساری عمر کا ریاض اپنانا پڑتا ہے" تو میں نے ہنس کر ماسٹر صاحب کو یقین دلا دیا کہ میں اس کام کے لئے کچھ زیادہ سنجیدہ نہیں ہوں۔ یہ تو بس ایسے ہی میری وقت کٹی کا ایک بہانہ ہے۔ ماسٹر بالی کو میری اس بات کا دکھ تو ہوا لیکن وہ خاموش ہو گئے۔ پلٹ کر کچھ کہا نہیں۔

چھٹیاں ختم ہونے سے کوئی ایک ہفتہ پہلے 'عید میلاد النبی' کے روز ہم نوجوانوں نے جامع مسجد کے گرد سوکھے سڑے پیڑوں کو بالٹیوں سے پانی اچھال اچھال کر دھویا۔ مشکیں بھر بھر کر سارے اردگرد کو ٹھنڈا ٹھار کیا۔ پھر مسجد کے دروازے سے کوئی سو فٹ جگہ چھوڑ کر سبز شاخوں اور کیلے کے تنوں کا دروازہ بنایا۔ اس پر سبز جھنڈیاں اور سنہرے پھول لگائے۔ مسجد کے باہری احاطے میں سٹیج بنا کر اور لوگوں کے گھروں سے دریاں اور کھیس منگوا کر زمین پر بیٹھنے کا بندوبست کیا۔ انہی دنوں ہمارے شہر میں سڑک کوٹنے کا انجن آیا تھا جو پرانی اور شکستہ سڑکوں کی مرمت پر مامور تھا۔ جب یہ انجن آگے پیچھے چلتا تو اس کے ہمراہ لوگوں کا ایک بڑا ہجوم ساتھ ساتھ حرکت کرتا۔ انجن ڈرائیور نذر حسین گھنگھریالے بالوں والا ایک عاشق مزاج نوجوان تھا جس کی کلائی سے موٹے نمبروں والی گٹ گھڑی بندھی تھی اور جو اپنے بائیں